ترقی پسند ادب، ''احتجاجی ترانے''، اساطیرِ آزادی

منیر سامی

(پروفیسر قمر رئیس کی یاد میں منعقدہ رائٹرز فورم کینیڈا کی تقریب میں پڑھا گیا)

میں نے اپنے اس عنوان کی ترکیب میں جو اصطلاحیں استعمال کرنے کی ہمت کی ہے، ان کا بہت ہی مختصر سا ذکر کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

اردو ادب میں 'ترقی پسند' کا لاحقہ برِصغیر کے ادب میں اس بے مثال انقلاب کے نتیجہ میں قائم ہو جو انجمن ترقی پسند مصنفین نے برپا کیا اور اس انقلاب کی موجِ تنک رنگ نہ صرف یار و اغیار کو بہالے گئی بلکہ آنے والے زمانوں تک اردو ادب میں وہ رجحان قائم کر گئی جس نے اردو زبان و ادب کو دنیا کی بڑی زبانوں اور بڑے ادب میں امتیازی درجہ عطا کیا۔

''احتجاجی ترانے'' کی ترکیب میں نے حال ہی شایع ہونے والی کتاب "Anthems of Resistance" سے مستعار لی ہے جس کے مصنف شمالی امریکہ میں مقیم دو دانشور بھائی، رضا میر اور علی حسین میر ہیں۔ میری رائے میں یہ کتاب انگریزی زبان میں اردو کے ترقی پسند ادب پر امتیازی اور بے مثال کتاب گردانی جائے گی۔

'اساطیرِ آزادی' دنیا کے ایک بہت اہم اور نظریہ ساز نقاد نورتھروپ فرائی کی وضع کردہ اصطلاح "Myths of Freedom" سے مستعار ہے۔ فرائی نے اپنے چند بہت اہم مضامین اور ادب اور سماج کے موضوع پر ایک اہم کتاب The Critcal Path میں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان اور ادب ہمیشہ جبر اور قدر کی ایک مسلسل جدلیاتی کشمکش میں مصروف رہتے ہیں اور ادیب کا منصب اساطیرِ آزادی کو سربلند و قائم کرنا ہے۔

ترقی پسند ادب پر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے غالب کا ایک شعر پیش کرتا ہوں، اور اگر آپ اس شعر کو مسلسل ذہن میں رکھیں تو شاید میری بات آپ تک بہتر طور پر پہنچ پائے۔ غالب نے کہا تھا کہ 'مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی، ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا۔

ترقی پسند ادب کی ابتدا بھی اس خرابی، یا بگاڑ، یا انقلاب سے ہوتی ہے، جو 'انگارے' نام کی کتاب نے نہ صرف برِصغیر میں بلکہ اردو اور دیگر زبانوں میں برپا کیا تھا۔ دس افسانوں پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۳۲ میں شایع ہوئی جس میں، پروفیسر احمد علی، سجاد ظہیر، محمود الظفر، اور محترمہ رشید جہاں کی تحریریں شامل تھیں۔

پروفیسر قمر رئیس اپنے مضمون 'اردو افسانے میں انگارے کی روایت' میں لکھتے ہیں، ''انگارے، اردو افسانوی ادب میں ذہنی بغاوت اور جرات آزما تخلیقی تجربات کی ایسی دستاویز ہے جس کی اہمیت کا احساس اور علم عام نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ یہ کتاب شایع ہونے کے فوراً بعد بحقِ سرکار ضبط کر لی گئی، اور ناشر کے پاس اس کے جو نسخے بچے وہ جلا دیئے گئے۔ کہانیوں کا یہ مختصر مجموعہ نہ صرف یہ کہ زوال

پذیر جاگیردارانہ معاشرت اوراس عہد کی ذہنی حقیقتوں کا مرقع تھا بلکہ اس آئینہ میں آنے والے دور کی حقیقتیں بھی اپنا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔
پریم چند کے بعد اردو افسانے کی جو نئی بساط بچھی، جو نئے رجحانات سامنے آئے، اُسے ان کا پیش رو ہی نہیں سرچشمہ بھی کہا جاسکتا ہے''۔
انگارے میں شایع ہونے والے افسانوں کے عنوانات یہ تھے، نیند نہیں آتی، جنت کی بشارت، گرمیوں کی ایک رات، دُلاری، پھر یہ ہنگامہ۔۔۔، بادل نہیں آتے، مہاوٹوں کی ایک رات، دلی کی سیر، پردے کے پیچھے، اور، جواں مردی۔
پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ،'' کہانیوں کا یہ مجموعہ صرف ۱۳۴ صفحات پر مشتمل تھا، اور ایک ہزار کی تعداد میں نظامی پریس لکھنو سے شائع ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق کے رسالے اردو اور دیا نرائن نگم کے رسالے 'زمانہ' میں اس پر جو ستائشی تبصرے ہوئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف نوجوانون نے اس باغیانہ تصنیف کو لبیک کہا بلکہ محتاظ اور اعتدال پسند ادیبوں نے بھی کھلے دل سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن کتاب کو شایع ہوئے ابھی صرف ڈیڑھ دو ماہ ہی گزرے تھے کہ قدامت پسند مذہبی علما کی طرف سے اس پر سخت حملے شروع ہوئے۔ ان کے اعتراض دو قسم کے تھے۔ اول یہ کہ کتاب میں جنت، دوزخ، خدا، علما اور مذہبی تصورات کا مذاق اڑا کر مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ کتاب میں عریانی ہے جس سے نوجوانوں کا اخلاق خراب ہوگا۔ یہ طوفان اس قدر بڑھا کہ یو۔ پی کے گورنر کی کونسل میں اس پر بحث ہوئی اور نتیجتاً اسے ممنوع قرار دے دیا گیا، جس کا باضابطہ اعلان مارچ ۱۹۳۳ کے سرکاری گزٹ میں ہوا۔''
کتاب کی ضبطی کے بعد 'زمانہ' کے مدیر دیا نرائن نگم نے بے پناہ اخلاقی اور ادبی جرات سے کام لیتے ہوئے، اس کتاب کی ضبطی پر تبصرہ کیا۔'' چار نوجوان مصنفوں نے جن میں ایک لیڈی ڈاکٹر بھی شامل ہیں، انگارے نام سے دس قصوں کو شایع کیا ہے۔ ان میں موجودہ زمانے کی ریاکاریوں پر روشنی ڈالنے اور مروجہ رسم ورواج کی اندرونی خرابیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہمارے نام نہاد اعلیٰ طبقہ کی روز مرہ معاشرت کے نقائص کا مضحکہ اڑایا گیا تھا۔۔۔ گو اس مجموعہ کا طرزِ بیان اکثر مقامات پر مذاقِ سلیم کو کھٹکتا تھا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ نوجوانانِ عالم نے دنیا میں جو علَمِ بغاوت بلند کر رکھا ہے، اسی کا ایک ادنیٰ کرشمہ اس کتاب کی اشاعت ہے۔۔۔ مولوی صاحبان کچھ ہی کیوں نہ کہیں، سوسائٹی کہ ہر طبقہ میں ریاکاری کے نقائص داخل ہوگئے ہیں۔۔۔ اب ان نقائص کو نمایاں کرنے والوں کو مردود و ملعون کرنے یا ان کی تحریر و تصنیف کو سرکاری اثرات سے کام لے کر ضبط کرا دینے سے ملک و مذہب کا کوئی بھلا نہیں کر سکتے ہیں''
کتاب پر پابندی کے فوراً بعد کتاب کے مصنفین نے اپنے دفاع میں ایک بیان جاری کیا جو الہ آباد سے جاری ہونے والے انگریزی جریدے لیڈر میں، Shall we submit to gagging کے عنوان سے شایع ہوا اور اسے محمود الظفر نے لکھا تھا۔ انہوں نے لکھا کہ ''اس کتاب کے مصنفین کسی قسم کی معافی کے طلبگار نہیں ہے۔ یہ کتاب خود ہی کامیاب یا ناکام ہوگی۔ ہم اس کو شایع کرنے اور اس قسم کے دوسرے طریقوں کو استعمال کرنے کے حق کا دفاع کرتے ہیں۔ ہمارا فوری مقصد ترقی پسند مصنفین کی ایک جماعت بنانا ہے جو آیندہ بھی وقتاً فوقتاً انگریزی اور دیگر زبانوں میں ایسے مجموعے جاری کرتی رہی۔''
یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ اب سے تقریباً بیس سال پہلے انگارے کو دوبارہ شائع کیا گیا۔ ایک ایڈیشن یورپ میں محترمہ شبانہ محمود نے، اور دوسرا ایڈیشن ہندوستان سے ڈاکٹر خالد علوی نے شایع کیا۔ انہوں نے اپنی کتاب کو پروفیسر قمر رئیس کے نام بھی منسوب کیا ہے۔

ڈاکٹر خالد علوی نے انگارے کے اس ایڈیشن میں جو ستم ظریفی کی وہ قابلِ توجہ ہے۔ وہ اپنی پیش گفت میں کہتے ہیں، ''تقریباً دس سال قبل جب میں نے دہلی یونیورسٹی میں ایم فل میں داخلہ لیا تھا تو انگارے کو اپنے مقدمہ کے ساتھ شایع کرنے کا قصد کیا۔ لیکن کتاب شایع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ اس درمیان میرے نظریات میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اپنے مقدمہ میں بھی جگہ جگہ ترمیم واضافی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن ممکن نہ ہوسکا۔ البتہ اپنے حقوق کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے افسانوں میں بعض جملوں کو حذف کردیا ہے تاکہ کیس کی دلآزاری نہ ہو''۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ایک جگہ میر کے مشہور شعر، میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب، اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں، سے استفادہ کرتے ہوئے سارے کے سارے مصرعہ ثانی ہی کو حذف کردیا۔ حیران ہو دل کو روؤں کے پیٹوں جگر کو میں۔

انگارے کی ضبطی کے بعد سجاد ظہیر اپنی تعلیم مکمل کرنے لندن چلے گئے اور اسی دوران ۱۹۳۴ کے آخر میں اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ ایک چینی ریستوراں میں جمع ہوکر انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک خاکہ ترتیب دیا۔ ان لوگوں میں ملک راج آنند، جیوتی گھوش، دین محمد تاثیر، پرمود سین گپتا اور سجاد ظہیر شامل تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ہندوستان میں اپنے ہم خیال ترقی پسند مصنفین سے مشاورت شروع کی جس کے نتیجہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا منشور لکھا گیا جسے مکمل طور پر پڑھے بغیر اس تحریک کے تاریخی تناظر کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اس منشور کے الفاظ یہ ہیں، ''اس وقت ہندوستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں، اور جان بلب رجعت پرستی جس کی موت لازمی اور حقیقی ہے، اپنی مدت بڑھانے کے لیئے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست وریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے۔ اور زندگی کے حقایق سے گریز کرکے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈتا رہا ہے۔ جس کے باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہوگیا ہے۔ اور اب شدید ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔

ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے اندازِ تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جاسکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشو ونما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب، اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔

ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں، اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پرستی کے خلاف جدوجہد کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے

تہذیب وتمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی، اور غلامی کے مسائل ہیں۔ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی، اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں، تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔''اس منشور کی روشنی میں جو قرارداد ترتیب دی گئی وہ یوں تھی:

۔۔ہندوستان کی مختلف لسانی اکائیوں میں انجمنوں کا قیام، ان انجمنوں کے درمیان روابط، کانفرنسوں، جرائد اور پمفلٹوں کا اجرا۔

۔۔ان تمام ادبی انجمنوں سے تعاون جو ہمارے منشور اور مقاصد کے خلاف نہیں ہیں۔

۔۔اعلیٰ درجہ کے ترقی پسند ادب کی تصنیف وتراجم، ثقافتی رجعت پرستی کے خلاف جدوجہد، اور اس طرح ہندوستان کی آزادی اور سماجی احیا کا اہتمام

۔۔ایک مشترک ہندوستانی زبان اور رسم الخط کا قیام

۔۔مصنفین کے حقوق کی حفاظت، اور مصنفوں کو ان کی تحریر کی اشاعت میں مدد

۔۔آزادی اظہار، خیال، اور رائے کے تحفظ کی جدوجہد

جن لوگوں نے منشور کی ترتیب کے فوراً بعد اس پر دستخط کیے ان میں منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، اور جوش ملیح آبادی، علی عباس حسینی، ساغر نظامی، ورنیاز فتح پوری سرِفہرست ہیں۔علامہ اقبال اور ٹیگور نے بھی ان اغراض ومقاصد کی حمایت کی تھی۔

۱۹۳۶ میں لکھنو میں انجمن کا پہلا اجلاس منشی پریم چند کی صدارت میں ہوا، جہاں نے اپنا تاریخی خطبہ دیا جس کا عنوان ''ادب کا مقصد'' تھا۔اس خطبہ کا خلاصہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ ''اب ہمیں حسن کے معیار بدلنے ہوں گے۔''

انجمن ترقی پسند مصنفین اور ترقی پسند تحریک منسلک اور منسوب مصنفین کی فہرست برِصغیر کے مصنفین کی ایک کہکشاں ہے جس کا نور اور تابانی تاابد درخشندہ ہے۔ان ناموں کی ایک مختصر اور نامکمل فہرست اس طرح سے ہے، منشی پریم چند، حسرت موہانی، اختر حسین رائے پوری، دین محمد تاثیر، ظ انصاری، رشید جہاں، محمود الظفر، سجاد ظہیر، احمد علی، عزیز احمد، فیض احمد فیض، سعادت حسن منٹو، وجیادن دھتا، بھیشم ساہنی، خاگندرہ ٹھاکر، ڈاکٹر نصرت جہاں، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، کرشن چندر، قراۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، راجندسنگھ بیدی، جوش ملیح آبادی، مخدوم محی الدین، غلام ربانی تاباں، مجروح سلطان پوری، ساحرلدھیانوی، مجاز، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، احمد فراز، فارغ بخاری، خاطر غزنوی، محسن احسان، ظہیر کاشمیری، عبداللہ ملک، حمید اختر، اختر حسین جعفری، احمد راہی، ابراہیم جلیس، خواجہ احمد عباس، سبطِ حسن، جذبی، خورشید الاسلام، باقر مہدی، قاضی عبدالغفار، مظہر امام، اختر پیامی، اختر الایمان، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جاں نثار اختر، مجتبیٰ حسین، عتیق احمد، احمد حسین، حسن عابدی، ظہور نظر، ممتاز حسین، شارب ردولوی، عارف عبدالمتین، میاں افتخار الدین، کشور ناہید، عشرت آفریں، فہمیدہ ریاض، اور نزہت صدیقی وغیرہ۔ترقی پسند ادب کے تمام تر ناموں کو جاننے کے لیئے چند کتابیں بہت مددگار ہوسکتی ہیں، ان میں سجاد ظہیر کی روشنائی، عزیز احمد کی ترقی پسند ادب، ڈاکٹر ارتضی کریم کی ترتیب کردہ 'ترقی پسند ادب۔وضاحتی کتابیات، علی سردار جعفری

کی ترقی پسند ادب، عاشور کاظمی اور قمر رئیس کی مرتبہ کتاب ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، اور حال ہی میں شایع ہونے والی رضا میر اور علی حسین میر کی انگریزی کتاب، Anthems of Resistance شامل ہیں۔ اس طویل لیکن غیر مکمل فہرست کی توجہ دلانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اندازہ کر پائیں کہ ترقی پسند ادب کا پھیلاؤ اور اثر کتنا وسیع، دوررس، اور بعید از زمانہ تھا۔ ان لکھنے والوں میں، نثر نگار، شاعر، صحافی اور نقاد شامل ہیں۔

ترقی پسند مصنفین نے نہ صرف یہ کہ نئے استعارے ایجاد کیئے بلکہ قدیم استعاروں کو بھی اپنی تحریروں میں نئے ڈھنگ سے باندھا۔ اسی طرح انہوں نے ایک نئی اسطورہ بھی ترتیب جس کا وجود ہر اسطورہ کی طرح ہمیشہ قائم رہجانے والا ہے۔

اگر ہم صرف شاعری ہی سے مثالیں تلاش کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ غمِ زمانہ کے اظہار کے لیئے ان لکھنے والوں نے زبان کی جمالیات اور حسیات کو کس طرح سے استعمال کیا کہ ان کا بیان دلوں کی گہرائیوں میں جگہ بناتا چلا گیا۔ یہاں صرف چند اشعار کے حوالے کافی ہیں۔

جی میں آتا ہے کہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں، اور اس کنار نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں (مجاز)

عہدِ انقلاب آیا دورِ آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے
اب زمین گائے گی ہل کے ساز پر نغمہ
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے
میں کہ ایک محنت کش، میں کہ تیرگی دشمن
صبحِ نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے
خودکشی بھی راس آئی دیکھ بدنصیبوں کو
خود سے بھی گریزاں ہیں بھاگ کر زمانے سے
دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
(مجروح)

دھرم کی بانسری سے ناگ نکلے
دو سو راخوں سے کالے ناگ نکلے

رکھو دیر و حرم کو اب مقفل
کئی پاگل یہاں سے بھاگ نکلے
ہمارے سرکار کہہ رہے تھے یہ لوگ پاگل نہیں تو کیا ہیں
کہ فرقِ افلاس و زر مٹا کر نظامِ فطرت سے لڑ رہے ہیں
نظامِ دولت، خدا کی نعمت، خدا کی نعمت سے لڑ رہے ہیں
ہر اک روایت سے لڑ رہے ہیں، ہر ایک صداقت سے لڑ رہے ہیں
مشیتِ حق سے ہو کے غافل خود اپنی قسمت سے لڑ رہے ہیں
یہ لوگ پاگل نہیں تو کیا ہیں
(جون ایلیا)

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا پرچار کرنے والوں کے درمیان کشمکش جاری و مسلسل ہے۔ ترقی پسند مصنفین پر اولین، آسان ترین اور رکیک ترین الزام کفر و الحاد کا رہا ہے، جس کی ابتدا انگارے کی اشاعت سے ہوئی اور یہ الزام تراشی ہمیشہ جاری رہے گی۔ ترقی پسند ادب کو پا بہ زنجیر اور فنا کرنے کی کوششوں میں رجعت پسند طبقات کو سرکاری جبر و استبداد کی حمایت فطری طور پر میسر آتی رہے، جس کے نتیجہ میں برِ صغیر کے ادیبوں کو قید و بند کی مشقتیں بھی جھیلنا پڑیں، اور کبھی جان بھی گوانا پڑی۔ لیکن شاعر پھر بھی یہی کہتے رہے کہ، جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے، یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں۔

خود ترقی پسند تحریک اپنی اولین کامیابیوں اور ادب اپر اپنے گہرے اثرات کے ساتھ نظریاتی سخت گیری بھی اپناتی گئی، اور یہ سخت گیری اپنے عروج پر جب پہنچی جب بھیمڑی کی کانفرنس میں اس تحریک کو کمیونسٹ پارٹی کے اغراض و مقاصدِ سے وابسطہ کر دیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں بہت سے ادیبوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین سے قطع تعلق کر لیا، لیکن وہ ترقی پسند ادب کے اصول سے قائم رہے اور ترقی پسند ادب کی قدر میں اضافہ کرتے رہے۔ اس ضمن میں خود فیض نے ایک انٹرویو میں کہا کہ، ''قیامِ پاکستان سے قبل برصغیر میں آزادی کی جو تحریک چلی تھی وہ مختلف مکاتیبِ فکر کے لوگوں کے درمیان ایک متحدہ محاذ کے قیام کا نتیجہ تھی۔ اس متحدہ محاذ میں جو لوگ شامل تھے ان کے سیاسی نظریات ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں تھے لیکن چند ایک باتوں پر سب کا اتفاق تھا۔ یعنی یہ کہ انگریزوں سے آزادی ملنی چاہیئے، عام آدمی کی زندگی میں آسائش اور سکون کا اضافہ ہونا چاہیئے۔۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد ذہنی انتشار پیدا ہوا۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہوا کہ آزادی تو حاصل ہو گئی لیکن اس کے بعد کیا کرنا چاہیئے۔ اس پر ترقی پسند تحریک میں شامل ہمارے دوستوں نے ذرا زیادہ ہی انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا کہ ہمیں فوراً انقلابی ہو جانا چاہیئے۔۔۔ اور ہوا یوں کہ جو لوگ ہمارے ساتھ تھے، جن کو ہمارے ساتھ رہنا چاہیئے تھا، ان کو ساتھ رکھ کر تحریک کو آگے بڑھانے کے بجائے ہم نے اپنا دائرہ یا حلقہ محدود کر لیا جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں تھا۔ اصولاً ہمیں ادیبوں اور شاعروں کے نظریات تک محدود رہنا چاہیے تھا، اور ہمیں ان کی تخلیقات احاطہ کرنے سے گریز کرنا چاہیئے تھا۔ تخلیقات کا احاطہ کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ منٹو، عصمت، اور قراۃ العین

حیدر جیسے ادیبوں کو اپنے دائرہ سے خارج کرنا پڑا، جس کا میں مخالف تھا۔''

ایک طرف تو ترقی پسند مصنفین کی آپس کی چپقلش نے انجمن کو نقصان پہنچایا، دوسری طرف کمیونسٹ نظریہ سے وابستگی کے الزام میں قیام پاکستان کے تقریباً فوراً ہی بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کو پاکستان میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کے مصنفین انجمن کے اولین منشور کی روح پر عمل کرتے ہوئے انسان دوست اور جبر مخالف ادب تخلیق کرتے رہے اور ترقی پسندی آج بھی جبر سے آزادی کا پرچار کرنے والوں کی جبلت میں شامل ہے۔

اگر ہم غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ ادب میں ترقی پسندی کا انقلاب ۱۹۳۶ سے ہندوستان کی آزادی اور قیام پاکستان اس طرح سے قائم ہو گیا تھا کہ اس کا اثر آج بھی موجود ہے، اور شاعروں اور ادیبوں کی نئی نسلیں مسلسل ترقی پسند ادب تخلیق کرنے میں مصروف ہیں۔

ہیت پرست نقادوں، جدید نقادوں، اور رجعت پرستوں کی مسلسل اور منظّم مخالفت کے باوجود ترقی پسند اثرات کی بقا کے اسباب کو جاننے کے لیئے ضروری ہے کہ ہم نورتھروپ فرائی کے نظریہء اسطورہء آزادی پر غور کریں۔ فرائی نے ادب اور سماج کے موضوع پر ایک اہم کتاب The Critical Path: An essay on the social context of literary criticism تحریر کی۔ لطف کی بات ہے کہ فرائی کا کہنا ہے کہ یہ کتاب چند مربوط مضامین کو طول دے کر لکھی گئی۔ ان میں سے ایک مضمون اس نے خود پاکستان میں ایک کانفرنس میں پڑھا تھا، جس میں فیض، ممتاز حسین، عبداللہ ملک، فتح محمد ملک اور دیگر ترقی پسند مصنفین بھی موجود تھے۔

فرائی نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ادب کی دو اساطیر کے درمیان دائمی جدلایاتی کشمکش جاری رہتی ہیں۔ یہ اساطیر 'اسطورہء معمالاتِ انسانی' اور 'اسطورہء آزادی' ہیں۔ اسطورہ معاملاتِ انسانی، سماج کی مرکزی اسطورہ ہوتی ہے جس میں سماج کے عقائد اور سماج کو باہمی طور پر قائم رکھنے کے قوانین شامل ہوتے ہیں۔ یہ مرکزی اسطورہ بنیادی اور ثانوی اسطورہ میں منقسم ہوتی ہے۔ بنیادی معاملات میں رزق، جنس، جائداد، اور نقل وحرکت کی آزادی شامل ہیں۔ ثانوی معاملات میں مذہب، سیاست، اور عقائد شامل ہیں۔ معاملاتِ انسانی کی اسطورہ اول اول سماج کی اجتماعی بھلائی اور حفاظت کی خاطر جنم لیتی ہے لیکن اگر انسان سماج کے طے شدہ اصولوں سے انحراف کرنے لگیں تو ان کی پر تشدد طریقہ پر اصلاح کی جاتی ہے۔ اس تشدد کا نتیجہ قدامت پرستی، اصول پرستی، اور ظالمانہ نظام کا قیام ہوتا ہے۔ اسطورہء آزادی آزاد خیالی اور سائنسی فکر پر مبنی ہوتی ہے، اور یہ معاملاتِ انسانی کے جبر کے مقابل رہتی ہے۔

اگر ہم ترقی پسند تحریک کے منشور پر غور کریں تو ہم اسے فرائی کی اسطورہء آزادی کے طابع پائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وقتاً فوقتاً رکاوٹوں اور مسلسل مخالفت کے باوجود ترقی پسند ادیب آزاد خیالی اور انسان دوستی کا پرچم بلند کیئے مسلسل آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے قیام کے بہتر سال کے بعد آج بھی ترقی پسند ادب کی تخلیق اور خود تحریک پر گفتگو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو ادب میں ترقی پسندی اور آزاد خیالی کے اصول مستحکم ہیں۔